

مکالمہ بین المذاہب کی جہات: مصطفوی منہج

(عرب کے یہود و نصاریٰ سے تعامل کی روشنی میں)

Mukalma Baina Mazahib ki Jihat: Mustafavi Manhaj
(Arab ke Yahud o Nasara se Tahamul ki Roshni Main)

Dr. Abdul Fareed Brohi*

Dr. Qari Zia ur Rehman**

Abstract

Islam is the religion of peace and coherence revealed to the Prophet Muhammad (peace be upon him) as a true guidance and mercy for the mankind. As the Prophet preached the message of Islam in Arabia, which later on spread in almost all the continents, Muslims interacted with the adherents of different religions, cultures, civilizations, ethnicities and creeds. When the Prophet migrated to Madinah; he had interacted there with the Jews of Madinah and later on with the Christians of Arabia. These encounters and models include the migration, battles, treaties and dialogues within and without. In human history, the cultures and civilizations are compelled to relate to one another on a continuous and constant basis. Although the move towards inter-religious dialogue was first started within a Protestant branch of the Christian church, and the idea of interfaith dialogue is relatively modern but some of its instances could be traced back to the history of Islam as well. The main theme of this study and research will focus on the Prophetic approach and methodology towards dialogue. The researcher will try to seek the answers of the issues of today's world which are being faced by the world in general and the Muslim Ummah in particular related to interfaith dialogue. The study will sort out the guidelines which could be found in the Life of the Prophet and the attitude and *Hikmah* (wisdom) of the Prophet towards dialogue seeking a Prophetic approach for the contemporary phenomenon of cultural and civilisational pluralism.

Keywords: Islam, Prophet Muhammad ﷺ, Dialogue, Christianity, Jews, Negus

سیرت طیبہ کے مطالعہ کے کئی پہلو ہیں اور اپنی جگہ سارے ہی اہم اور منفرد ہیں۔ زیر نظر مقالہ میں آپ کی حیات طیبہ کے جس پہلو کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے وہ دیگر مذاہب کے ساتھ آپ کا ربط، تعامل اور ان سے معاملات اور مکالمہ کرنا ہیں۔ خاص طور پر خطہ عرب میں موجود یہود اور نصاریٰ سے آپ نے جو معاملات اور معاہدات کیے۔ مکالمہ ایک جدید اصطلاح ہے۔ جس کے لیے عربی میں الحوار اور انگریزی میں Dialogue استعمال ہوتا ہے۔ سیرت کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے جب آپ کی زندگی کے اس پہلو کا جائزہ لیا جا رہا ہے تو ایک بات بہت نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے کہ نوجوانی سے لے کر فتح مکہ اور وصال تک آپ کی طبیعت میں حلم، بردباری، احترام انسانیت اور اکرام آدمیت بہت نمایاں ہے۔ آپ کی حیات طیبہ میں دعوت کے ابلاغ کے لیے دلیل اور آج کی اصطلاح میں مکالمہ ایک حیثیت رکھتا ہے۔ زیر

* Assistant Professor, International Islamic University, Islamabad.

Email: abdul.fareed@iiu.edu.pk

** Assistant Professor, International Islamic University, Islamabad.

Email: ziarehman@iiu.edu.pk <https://orcid.org/0000-0003-4869-3208>

نظر مقالہ میں بھی قرآن اور سیرت طیبہ سے رہنمائی لینے کی کوشش کی گئی ہے کہ مکالمہ بین المذاہب کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کا کیا طرز عمل تھا؟ گو کہ یہ ایک جدید اصطلاح ہے جو مغرب میں کافی مقبول ہے۔ لیکن کیا قرآن و سنت میں بھی ہمیں کوئی حوالہ ملتا؟ زیر نظر مقالہ میں ان سوالوں کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مکالمہ بین المذاہب ایک جدید اصطلاح ہے۔ جس کے لیے عربی میں الحوار بین الادیان اور انگریزی میں Interfaith Dialogue استعمال ہوتا ہے۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ مکالمہ بین المذاہب (Interfaith Dialogue) ایک مغربی تصور ہے جس کا آغاز انیسویں صدی کی پہلی دہائی میں ہوا اور جسے عیسائی کلیسا خاص طور پر پروٹسٹنٹ فرقہ کے عیسائیوں نے بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں باقاعدہ منظم کیا اور آنے والی دہائیوں میں اس میں عیسائی کلیسا کے علاوہ دیگر مذاہب کے ماننے والوں کو بھی شامل کیا گیا (۳)۔ یہ بات کسی حد تک درست ہے۔ جب مکالمہ بین المذاہب کو فروغ حاصل ہوا تو مسلم اہل علم نے اس پر اپنا رد عمل مختلف انداز میں دیا۔ چونکہ مکالمہ بین المذاہب کا محرک، مغرب یعنی West تھا، اس بناء پر کچھ مسلمانوں نے اسے اسلام کے خلاف ایک سازش سمجھا اور کچھ نے اس کا خیر مقدم کیا۔ یہاں ایک بات قابل توجہ ہے کہ عمومی طور پر مکالمہ ان خطوں میں زیادہ معروف ہے جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں خاص طور پر یورپ اور امریکہ۔ ان ممالک میں بھی ایک رد عمل یہ تھا کہ چونکہ اسلام واحد سچا دین ہے اس لیے ہمیں مکالمہ کی ضرورت نہیں اور یہ کہ مسلمانوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس سچے دین کی تبلیغ کریں اور اس کی اشاعت کریں۔ دوسری جانب کئی اہل علم مکالمہ کو قرآن و سنت کے مطابق سمجھتے ہیں۔ ان کی رائے میں دعوت کے ابلاغ کے لیے مکالمہ ایک بہترین اور کارگر آلہ (Tool) ہے جس سے دیگر مذاہب کے ماننے والوں کو سمجھنے اور اپنی بات بہتر انداز میں پہنچانے کا موقع ملتا ہے۔ دائرہ اسلام میں دوسروں کو داخل کرنے کے حوالے سے قرآن کی آیت ’لا اکراہ فی الدین‘ (۴) یعنی دین میں کوئی جبر نہیں۔ بڑی واضح ہے۔ اسلام کی تاریخ میں، خاص طور پر عہد نبوی ﷺ اور خلافت راشدہ کے بارے میں حتمی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ کسی کو جبر کے ساتھ کبھی مسلمان نہیں بنایا گیا۔ بلکہ مسلمانوں کے پیش نظر ہمیشہ یہ آیت رہی ہے:

ادع إلى سبيل ربك بالحكمة والموعظة الحسنة (۵)

ترجمہ: اپنے رب کی طرف حکمت اور بہترین نصیحت سے (لوگوں) کو دعوت دو۔

نبی مہربان صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دنیا میں بعثت بنی نوع انسان کے لیے رحمت ہی رحمت کا باعث ہے۔ آپ ﷺ کی آمد سے پہلے پوری دنیا کی حالت عام طور پر اور جزیرہ نما عرب کی حالت خاص طور پر بہت ابتر تھی۔ نہ کوئی نظام تھا اور نہ ہی معروف معنوں میں کوئی تہذیب تھی۔ پوری کی پوری انسانیت تاریکیوں اور اندھیروں میں ڈوبی ہوئی تھی، شرک اور بت پرستی اپنے عروج پر تھی اور جن خطوں میں بادشاہتیں قائم تھیں وہاں دہشت کا راج تھا۔ بڑے بڑے محل و حشت کی تصویر بنے پھر رہے تھے۔ خون پانی سے سستا اور عورتیں نیلامی کا مال بن چکی تھیں۔ عرب جس کے معنی ہی بے آب و گیاہ زمین اور صحرا کے ہیں، ان میں معاشرتی اور دینی حوالوں سے کافی بگاڑ آچکا تھا۔ جوا، شراب نوشی اور بدکاری ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھیں۔ دین ابرہیمی، جس کے کہ وہ دعویٰ اور پیر و کار تھے، اس میں قسم قسم کی بدعات رواج پا چکی تھیں۔ یہ

تھے وہ حالات جن کا یہاں ایک مختصر خاکہ کھینچا گیا ہے اور جو کتابوں میں معروف ہیں، ان حالات میں محسن انسانیت، فخر موجودات محمد مصطفیٰ ﷺ اس دنیا میں تشریف لائے۔ آپ کا نام محمد صلی اللہ علیہ وسلم رکھا گیا جو اس سے پہلے کسی کا نام نہ تھا۔ آپ ﷺ کی دعوت اور آپ کا کلمہ یقینی طور پر پوری دنیا کے لیے جاں فزا کلمہ تھا۔ آپ نے جو دعوت پیش کی اور دنیا کو جس دین اور نظام کی جانب بلا یا اس نے دنیا کا نقشہ ہی بدل ڈالا۔ آپ کا لایا ہوا پیغام ایک مکمل نظام حیات ہے۔ دین اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جو زندگی کے ہر شعبہ کے لیے رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ ہر دور کی انسانی ضروریات اور تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت اور استعداد رکھتا ہے۔ اسلام کی اسی گہرائی اور گیرائی کے متعلق قرآن پاک میں اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ (۱)

ترجمہ: یعنی سچا دین تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف اسلام ہے۔

اس کی وضاحت مفسر تفہیم القرآن ان الفاظ میں کرتے ہیں: ”قرآن کا دعویٰ یہ نہیں کہ اللہ کے نزدیک اسلام ایک حقیقی طریق زندگی ہے بلکہ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ اسلام ہی ایک حقیقی اور صحیح طریق زندگی یا طرز فکر ہے۔ قرآن اس لفظ کو کسی محدود معنی میں استعمال نہیں کرتا بلکہ وسیع ترین معنی میں استعمال کرتا ہے۔“ (۲)

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جوانی میں قدم رکھا تو آپ کی عادات و اطوار عام جوانوں سے قدرے مختلف تھیں۔ آپ کی طبیعت میں سنجیدگی اور تدبر غالب تھی۔ پندرہ سال کی عمر میں جنگ فجار میں صرف اس بناء پر شرکت کی کہ اس میں آپ قریش کو حق بجانب سمجھتے تھے۔ اس جنگ کے بعد مظلوموں کی دادرسی اور مدد اور ظالموں کے ظلم اور ان کی چہرہ دستیوں کے خاتمے کے لیے ایک عہدہ بیان کیا گیا جو حلف الفضول کے نام سے معروف ہے۔ قریش کے چند ممتاز اور سن و شرف والے لوگوں نے آپس میں یہ عہدہ باندھا کہ مکہ میں جو بھی مظلوم نظر آئے گا اس کی مدد کی جائے گی، خواہ اس کا تعلق مکہ سے ہو یا نہ ہو۔ اگر کسی کا حق مارا گیا ہو تو سب اس کی حمایت کریں گے اور اسے اس کا حق دلا دیں گے اور اس کی حمایت اور مدد کی جائے گی۔ جب حلف الفضول کے نام سے یہ عہدہ و پیمانہ قائم کیا جا رہا تھا، اس موقع پر آپ اس میں شریک ہوئے۔ بعد میں شرف رسالت پانے کے بعد آپ اس کی یاد تازہ کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے،

”میں عبد اللہ بن جدعان کے مکان پر ایک ایسے معاہدے میں شریک تھا کہ اس معاہدہ کے مقابلے میں اگر مجھ کو سو سرخ اونٹ بھی دیے جاتے تو میں اس سے نہ پھرتا۔ اور آج بھی ایسے معاہدہ کے لیے کوئی بلائے تو میں حاضر ہوں۔“ (۶)

اس پورے واقعہ سے جو پہلو سامنے آتا ہے اس میں ہمارے لیے رہنمائی کے کئی اجزاء اور اسباق ہیں۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو جب بھی کوئی معاملہ درپیش ہوا تو آپ نے ہمیشہ حق کا ساتھ دیا اور معاملے کو حکمت، تدبر اور باہم مکالمہ سے حل کرنے کی کوشش کی۔ خانہ کعبہ کی تعمیر نو اور حجر اسود کا دوبارہ نسب کیا جانا اس کی ایک اور بڑی مثال ہے۔ یہ بات معروف ہے اور سیرت نگاروں نے اس واقعہ کو بالتفصیل بیان کیا کہ جب آپ کی عمر مبارک تقریباً پینتیس (۳۵) سال تھی، اس سال اہل مکہ نے خانہ کعبہ کی از سر نو تعمیر کا فیصلہ کیا۔ چونکہ اس کی تعمیر کو ایک طویل

عرصہ گذر چکا تھا اور عمارت کافی بوسیدہ اور خستہ حال ہو چکی تھی اور اس کی دیواریں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکی تھیں۔ اس سال مکہ میں سیلاب آیا۔ اس کے نتیجے میں جہاں اور نقصان ہوا، اس نے خانہ کعبہ کا رخ کیا اور کمزور ہو کر خانہ کعبہ ڈھ جانے والی کیفیت میں آگیا۔ مجبوراً اس کا مقام و مرتبہ برقرار رکھنے کے لیے قریش نے اس کی از سر نو تعمیر کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ کعبہ کو ڈھا کر اس کی تعمیر حلال اور طیب مال سے کی گئی۔ جب حجر اسود کو نصب کرنے کا مرحلہ آیا تو ایک نیا جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا۔ ہر ایک قبیلہ حجر اسود کو اس کی جگہ نصب کر کے عزت و شرف اور امتیاز کا خواہاں تھا۔ پانچ روز تک یہ جھگڑا جاری رہا۔ اس تنازع نے اتنی شدت اختیار کر لی کہ میانوں سے تلواریں نکل آئیں اور اندیشہ تھا کہ سرزمین حرم میں سخت خون خرابہ ہو جائے گا۔ لیکن نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حکیم اور بردباد صفت اور صلاحیت سے یہ مسئلہ بڑی آسانی سے حل ہو گیا۔ آپ نے انتہائی جذباتی تناؤ کو کم کیا اور باہم رضامندی سے ایک چادر بچھائی، اس پر حجر اسود کو رکھا اور تمام قبیلوں کو دعوت دی کہ وہ چادر کو کونوں سے پکڑیں اور چادر بلند کریں۔ پھر آپ نے خود اپنے دست مبارک سے اس پتھر کو اٹھا کر اس کی جگہ نصب کر دیا اور سارا جھگڑا آپ کی صلح جو طبیعت اور مکالمہ کے نتیجے میں بغیر خون خرابہ کے حل ہو گیا جس سے پوری قوم راضی ہو گئی۔ یہ تھی آپ کی معاملہ فہمی جس کی بدولت آپ نے اپنے فہم اور تدبیر اور فراست سے گفت و شنید کے ذریعے حکمت کے ساتھ بڑے بڑے جھگڑے نمٹائے۔ نبوت کے بالکل ابتدائی زمانے سے ہی آپ کا واسطہ دیگر مذاہب کے پیروکاروں سے ہوا۔ گو کہ ابتدائی دور میں معدودے چند واقعات اس ضمن میں ملتے ہیں لیکن موجودہ دور میں حقوق مصطفیٰ صلی اللہ علیہ السلام اور اس کے تقاضوں کی تکمیل کے لیے یہ واقعات رہنمائی کے لیے کافی ہیں۔

قریش کے عام لوگوں سے آپ کی سوچ اور فکر قدرے مختلف تھی۔ آپ ان تمام چیزوں سے دور تھے جن میں مشرکین مکہ مبتلا تھے۔ اس ذہنی اور فکری خلیج کی وجہ سے آپ کو تنہائی پسند آنی شروع ہوئی۔ آپ زاد راہ اپنے ساتھ لے کر غار حرا میں جا رہتے اور غور و فکر فرماتے۔ آپ کے مشاہدے میں اپنی قوم کے حالات تھے جن پر آپ مطمئن نہ تھے، لیکن آپ کے سامنے اس وقت کوئی واضح راستہ اور معین طریقہ نہ تھا۔ آپ کی یہ تنہائی پسندی اس جانب آپ کی رہنمائی کا ایک ذریعہ تھی جو آپ کو ایک بڑے مقصد کے لیے تیار کر رہی تھی۔ مولانا صنی الرحمن مبارکپوری نے اس پوری کیفیت کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں،

”نبی صلی اللہ علیہ السلام کی یہ تنہائی پسندی بھی درحقیقت اللہ تعالیٰ کی تدبیر کا ایک حصہ تھی۔ اس طرح اللہ تعالیٰ آپ کو آنے والے کار عظیم کے لیے تیار کر رہا تھا۔ درحقیقت جس روح کے لیے بھی یہ مقدر ہو کہ وہ انسانی زندگی کے حقائق پر اثر انداز ہو کر ان کا رخ بدل ڈالے اس کے لیے ضروری ہے کہ زمین کے مشاغل، زندگی کے شور اور لوگوں کے چھوٹے چھوٹے ہم و غم کی دنیا سے کٹ کر کچھ عرصے کے لیے الگ تھلگ اور خلوت نشین رہے۔“ (۷)

سنت اللہ کے مطابق، آپ نے خلوت نشینی اختیار کیے ہوئے تھی جس کے بعد آپ کو ایک بڑی بھاری ذمہ داری سونپی جانے لگی۔ نبی کریم ﷺ جب چالیس برس کے ہوئے تو آپ کو نبوت عطا ہوئی۔ غار حرا میں جبریل امین علیہ السلام وحی لے کر آئے۔ آپ پر گھبراہٹ طاری ہوئی اور آپ فوری طور پر واپس گھر تشریف لے آئے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے آپ کو تسلی دی اور یہ معروف واقعہ

ہے۔ پھر وہ آپ کو اپنے چچیرے بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں۔ ورقہ بن نوفل مذہباً نصرانی تھے۔ سریانی لکھنا جانتے تھے اور اس زبان میں انجیل لکھا کرتے تھے۔ (۸) ان کی بینائی جاچکی تھی اور اس وقت بہت بوڑھے تھے۔ نبی مہربان ﷺ کا نبوت کے بعد جو پہلا مکالمہ ہوا وہ دراصل ورقہ بن نوفل سے ہوا۔ گو اس وقت یہ مکالمہ آج کل کی جدید اصطلاح میں مکالمہ بین المذاہب تو نہ تھا، لیکن اس میں جو سوال جواب ہوئے اور جس طرح سے ورقہ نے آپ سے استفسارات کیے وہ آج کے دور میں دیگر مذاہب کو سمجھنے اور ان سے معاملات کرنے میں معاون و مددگار ہو سکتے ہیں۔

تاریخ اسلام میں ہجرت حبشہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور سیرت طیبہ کا یہ ایک اہم باب ہے۔ مکہ میں عام دعوت کے بعد قریش کی جانب سے اس کلمہ کی سخت مخالفت کی گئی۔ آپ اور آپ کے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے گئے۔ مسلمانوں میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو جو ان کے ظلم و جور کا شکار نہ ہوا ہو۔ ہجرت، یعنی خدا کے کلمہ کی سر بلندی کے لیے اپنا گھر بار چھوڑنا انبیاء کی سنت رہی ہے سو نبی علیہ السلام کو بھی یہ مرحلہ درپیش آنا تھا۔ لیکن ابھی اذن الہی نہ تھا۔ تاہم حضور ﷺ مسلمانوں کے اوپر ہونے والے ظلم و ستم کو دیکھ رہے تھے کہ ان کے صبر کا پیمانہ چھلک رہا ہے۔ مسلمان مضطرب تھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی۔ ان حالات میں نبی مہربان ﷺ نے صحابہ کو مشورہ دیا کہ ”زمین میں کہیں نکل جاؤ، اللہ جلد ہی تمہیں کسی جگہ جمع کر دے گا۔“ پوچھا گیا کہ کس سر زمین میں جائیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ملک حبش (موجودہ ایتھوپیا) کی طرف اشارہ کیا اور انہیں بتایا کہ وہاں ایک عیسائی بادشاہ نجاشی حکومت کرتا ہے، جس کے ملک میں کوئی ظلم نہیں ہوتا۔ نعیم صدیقی کے الفاظ میں دراصل رسول خدا کے علم میں تھا کہ وہاں کی بادشاہت انصاف پر قائم ہے اور عیسائیت کی مذہبی بنیادوں پر چل رہی ہے۔ اسی لیے آپ نے فرمایا ”ہی ارض صدق“، یعنی وہ سر زمین راستی ہے۔ (۹)

سیرت طیبہ ﷺ میں یہ واقعہ بڑی اہمیت کا حامل ہے، جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے دعوتی اور تبلیغی پہلو خاص طور پر مکالمہ بین المذاہب کے پہلو کو نمایاں اور اجاگر کرتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ کی ہدایت اور حکم اور فتنوں سے اپنے دین کو بچانے کے لیے نبوت کے پانچویں سال صحابہ کرام کا پہلا گروہ جو سولہ افراد پر مشتمل تھا، حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی امارت میں حبشہ روانہ ہو گیا۔ قریش کو اس کی اطلاع ملی تو اس وقت تک مسلمانوں کا قافلہ نکل چکا تھا اور قریش کے ہاتھ کچھ نہ آسکا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد مسلمانوں کا ایک بڑا قافلہ جو تقریباً ۸۲ یا ۸۳ مردوں اور ۱۸ (اٹھارہ) عورتوں پر مشتمل تھا، حبشہ پہنچ گیا۔

حبشہ آکر مسلمانوں کو پوری آزادی تھی، اس لیے یہ مسلمان حبشہ میں تبلیغ کرنے لگے۔ اس دعوت و تبلیغ کے نتیجے میں کم از کم چالیس پچاس حبشی مسلمان ہو گئے۔ (۱۰) مکہ میں جب یہ اطلاعات پہنچیں تو مکہ والوں نے اپنا ایک وفد نجاشی کے دربار میں بھیجا اور مسلمانوں کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ یہاں ہم اس واقعہ کو بالتفصیل بیان کریں گے کہ اس سے دعوت و تبلیغ اور خاص طور پر مکالمہ بین المذاہب کے حوالے سے رہنمائی ملتی ہے۔ مشرکین مکہ نے نجاشی کے دربار میں ایک اعلیٰ سطح کا سفارتی وفد بھیجا جس میں عمرو بن العاص اور عبد اللہ بن ربیعہ جیسے، مجھ بوجھ رکھنے والے افراد تھے۔ یہ وفد کافی تحفہ تحائف لے کر نجاشی کے دربار میں پہنچا اور اپنا مدعا یوں بیان کیا:

”اے بادشاہ آپ کے ملک میں ہمارے کچھ ناصبھ نوجوان بھاگ آئے ہیں۔ انہوں نے اپنی قوم کا دین چھوڑ دیا ہے۔ لیکن آپ کے دین میں بھی داخل نہیں ہوئے بلکہ ایک نیا دین ایجاد کیا ہے۔ جسے نہ ہم جانتے ہیں اور نہ آپ۔ ہمیں آپ کی خدمت میں انہی کی بابت ہمارے قبیلے کے علمائین نے بھیجا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ آپ انہیں ان کے پاس واپس بھیج دیں کیونکہ وہ لوگ ان پر کڑی نگاہ رکھتے ہیں اور ان کی خامی اور عتاب کے اسباب کو بہتر سمجھتے ہیں۔“

اس موقع پر درباریوں اور پادریوں نے بھی ان دونوں کی تائید کی مگر نجاشی نے یک طرفہ طور پر کارروائی کرنے اور مکہ کے وفد کے مطالبے کی بنا پر فیصلہ کرنا مناسب نہ سمجھا اور خیال کیا کہ اس معاملہ کے تمام پہلوؤں کو سننا ضروری ہے، چنانچہ اس نے صاف الفاظ میں کہا کہ جب تک مسلمانوں سے مکمل احوال نہ دریافت کیے جائیں اس وقت تک انہیں قریش کے حوالے نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ اس نے مسلمانوں کو بلا بھیجا کہ ان کے پاس قریش کے الزامات کا کیا جواب ہے۔ دوسرے دن دربار میں مسلمان آئے۔ مسلمانوں نے آپس میں یہ طے کیا تھا کہ نتیجہ چاہے کچھ بھی ہو ہم اپنی بات سچائی اور دلیل کے ساتھ دیں گے۔ یہ ایک بہت بڑا موقع تھا جہاں بادشاہ وقت کے سامنے اپنے دین کے دفاع اور دعوت و تبلیغ کا موقع مل رہا تھا۔ جب مسلمان آگئے تو نجاشی نے ان سے دریافت کیا کہ یہ کون سا دین ہے جس کی بنیاد پر تم نے اپنی قوم سے علیحدگی اختیار کر لی ہے، اور میرے دین میں بھی داخل نہیں ہوئے ہو، اور نہ ہی ان ملتوں ہی میں سے کسی کے دین میں داخل ہوئے ہو۔ تم لوگوں پر الزام ہے کہ تم اپنے شہر میں فتنہ فساد کرتے رہے ہو اور وہاں کی سزا سے بچنے کے لیے یہاں آکر پناہ گزین ہو گئے ہو، تم لوگوں کا کیا جواب ہے؟ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی حضرت جعفر طیار رضی اللہ تعالیٰ عنہ مسلمانوں کی طرف سے جواب دیتے ہیں۔ یہاں ڈاکٹر حمید اللہ کا ذاتی استنباط نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہو گا جو انہوں نے نبی کریم ﷺ کے مکتوبات کے ضمن میں کی ہے۔ خطبات بہا پور میں ان کا بیان ہے: ”ایک ذاتی استنباط آپ سے بیان کرتا ہوں جس کا ذکر ہمیں تاریخ میں نہیں ملتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکتوبات میں نجاشی کے نام ہمیں ایک مکتوب ایسا بھی ملتا ہے، جس کا مضمون یہ ہے کہ ”میں اپنے چچا زاد بھائی جعفر رضی اللہ عنہ کو تیرے پاس بھیج رہا ہوں۔ جب وہ پہنچے تو اس کی اور اس کے ساتھیوں کی مہمانداری کر، ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کر اور اس بارے میں ہٹ دھرمی اختیار نہ کر۔“ طبری میں یہ خط موجود ہے جسے وہ ۷ھ کے حالات، میں درج کرتا ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا، یہ ممکن نظر آتا ہے کہ یہ خط جعفر طیار رضی اللہ عنہ کو بطور تعارف دیا گیا ہو، خط لے کر گئے ہوں اور نجاشی کو ۵ نبوی میں دیا ہو کیونکہ ۷ھ ہجری میں مسلمان مہاجرین حبشہ میں پندرہ سال گزار کر مدینہ واپس جا رہے تھے۔ واپسی کے وقت پناہ طلبی کے لیے تعارفی خط بھیجنا فضول سی بات نظر آئے گی۔ اس لیے مورخوں کے سکوت کے باوجود یہ کہنا پڑتا ہے کہ مہاجرین کی اولین جماعت جس وقت حبشہ گئی ہوگی، اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یہ تعارفی خط دیا ہو گا۔ قطع کلام کر کے یہ عرض کرتا چلوں کہ سہیلی کے مطابق یہ نجاشی ایک زمانے میں اپنے ظالم چچا کی وجہ سے عرب میں سکونت پذیر ہونے پر مجبور ہوا، اور مقام بدر میں رہتا تھا۔ بدروہ مقام ہے جہاں قریشی کاروان شام کو جانے اور وہاں سے واپس آنے کے وقت منزل کیا کرتے تھے۔ ممکن ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی کاروانی سفر کے وقت، بعثت سے قبل، اس سے

شخصی تعارف حاصل ہوا ہو۔“ (۱۱) یہاں یہ بات بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ جعفر طیار رضی اللہ عنہ، جو مسلمانوں کی ترجمانی کر رہے تھے، انہوں نے نجاشی سے مکہ کی سفارت سے کچھ سوالات کرنے کی اجازت طلب کی۔ یہ دراصل نجاشی کے ساتھ مکالمہ سے پہلے عمرو رضی اللہ عنہ بن العاص، جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے، کے ساتھ ایک مکالمہ تھا جس کے نتیجے میں مسلمانوں کی اخلاقی پوزیشن پوری طرح صاف ہو گئی۔

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے سوال کیا: ”کیا ہم کسی کے غلام ہیں جو آقا سے بھاگ آئے ہوں؟ کہ ہمیں واپس کیا جانا چاہیے۔“ عمرو بن العاص: ”نہیں، یہ لوگ کسی کے غلام نہیں، آزاد شرفاء ہیں۔“

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ: کیا ہم کسی کو ناحق قتل کر کے آئے ہیں؟ اگر ایسا ہو تو آپ ہمیں اولیائے مقتول کے حوالے کر دیں۔“ عمرو بن العاص: ”نہیں، انہوں نے خون کا ایک قطرہ بھی نہیں بہایا۔“

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ: ”کیا ہم کسی کا کچھ مال لے کر بھاگے ہیں، اگر ایسا ہو تو ہم اس کی ادائیگی کرنے کو تیار ہیں۔“ عمرو بن العاص: ”نہیں، ان کے ذمہ کسی کا ایک ہبہ بھی نہیں۔“

اس جرح سے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے مکالمہ کا انداز اختیار کر کے نہ صرف بہتر انداز میں اپنی پوزیشن واضح کی بلکہ اپنے اوپر لگنے والے الزامات کی تردید اور انہیں غلط ثابت کیا۔ نجاشی کے سامنے انہیں اپنی صفائی کا موقع ملا تھا تو اس براہ راست سوال جواب کے بعد حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک طویل تقریر کی جس کا خلاصہ یہاں بیان کیا جا رہا ہے۔ اس میں انہوں نے بالکل واضح انداز میں اسلام کی تعریف اور اپنے عقیدہ کو بیان کیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جو دعوت لے کر اٹھے تھے، اپنے سابقہ احوال کو بیان کرتے ہوئے اسے نجاشی کے سامنے پیش کیا۔ انہوں نے کہا:

”اے بادشاہ! ہم لوگ ایک جاہل قوم تھے، بتوں کو پوجتے تھے، مردار کھاتے تھے، بدکاریاں کرتے تھے، ہمسایوں کو ستاتے تھے، بھائی بھائی پر ظلم کرتا تھا، طاقتور کمزور کو کھا جاتے تھے، ہمارا حال میں تھے کہ اللہ نے ہم ہی میں سے ایک رسول بھیجا، جس کی شرافت، سچائی اور دیانت سے، سب لوگ پہلے سے واقف تھے، اس نے ہمیں اللہ کی طرف بلایا، اسلام کی دعوت دی اور سمجھایا کہ ہم صرف ایک اللہ کو مانیں اور اسی کی عبادت کریں اور اس کے سوا جن پتھروں اور بتوں کو ہمارے باپ دادا پوجتے تھے، انہیں چھوڑ دیں، اس نے ہمیں سچ بولنے، امانت ادا کرنے، قربت جوڑنے، پڑوسی سے اچھا سلوک کرنے اور حرام کاری اور خونریزی سے باز رہنے کا حکم دیا، اور فواحش میں ملوث ہونے، جھوٹ بولنے، یتیم کا مال کھانے اور پاک دامن عورتوں پر جھوٹی تہمت لگانے سے منع کیا۔ اس نے ہمیں یہ بھی حکم دیا کہ ہم صرف اللہ کی عبادت کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ اس نے ہمیں نماز روزہ اور زکوٰۃ کا حکم دیا۔“

حضور نبی کریم ﷺ کی دعوت کے اجزاء بیان کرنے کے بعد حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے اسلام کی برکات اور ثمرات گنوائے اور اسلام قبول کرنے کے نتیجے میں بحیثیت مجموعی جو اثرات ان کی زندگیوں پر مرتب ہوئے اور انہیں جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ان کا ذکر نجاشی کے

سامنے کیا۔ اسے ملاحظہ کرنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ مکالمہ دعوت و تبلیغ کا ایک اہم اور مؤثر ہتھیار ثابت ہو سکتا ہے اگر اسے بروقت اور حکمت سے استعمال کیا جائے۔ جذبات کے ساتھ ساتھ بات میں سچائی اور دل میں تڑپ ہو تو مصطفوی منہج نکھر کر سامنے آتا ہے۔ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا:

”ہم نے اس پیغمبر کو سچا مانا، اس پر ایمان لے آئے، اور اس کے لائے ہوئے دین خداوندی میں اس کی پیروی کی۔ چنانچہ ہم نے صرف اللہ کی عبادت کی، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کیا، اور جس باتوں کو پیغمبر اسلام نے حرام بتایا انہیں حرام مانا، اور جن کو حلال بتایا انہیں حلال جانا۔ اس پر ہماری قوم ہم سے بگڑ گئی۔ اس نے ہم پر ظلم و ستم کیا اور ہمیں ہمارے دین سے پھیرنے کے لیے فتنے اور سزاؤں سے دوچار کیا۔ تاکہ ہم اللہ کی عبادت چھوڑ کر بت پرستی کی طرف پلٹ جائیں، اور جن گندی چیزوں کو حلال سمجھتے تھے انہیں پھر حلال سمجھنے لگیں۔ جب انہوں نے ہم پر بہت قہر و ظلم کیا، زمین تنگ کر دی اور ہمارے درمیان اور ہمارے دین کے درمیان روک بن کر کھڑے ہو گئے تو ہم نے آپ کے ملک کی راہ لی۔ اور دوسروں پر آپ کو ترجیح دیتے ہوئے آپ کی پناہ میں رہنا پسند کیا۔ اور یہ امید کی کہ اے بادشاہ! آپ کے پاس ہم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔“

نجاشی حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی مدلل اور تفصیلی گفتگو سے بہت متاثر ہوا اور کہنے لگا کہ وہ پیغمبر جو کچھ لائے ہیں اس کتاب کا بھی کوئی حصہ سناؤ، چنانچہ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے سورہ مریم کی ابتدائی آیات تلاوت فرمائیں۔ کلام الہی سن کر بادشاہ کے دل پر رقت طاری ہو گئی، اس کی آنکھیں پر نم اور داڑھی تر ہو گئی۔ دربار میں موجود درباری اور پادری بھی حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی تلاوت سن کر اس قدر روئے کہ ان کے ہاتھوں میں موجود صحیفے تر ہو گئے۔ نجاشی بے اختیار پکار اٹھا: ”خدا کی قسم! یہ کلام اور وہ کلام (انجیل) جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام لے کر آئے تھے، دونوں ایک ہی چراغ کے پر تو ہیں۔ کچھ روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ نجاشی نے یہ بھی کہا کہ مجھ تو وہی رسول ہیں جس کی خبر یسوع مسیح نے دی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ مجھے اس رسول کا زمانہ ملا۔ اس کے بعد نجاشی نے عمر بن العاص اور عبد اللہ بن ربیعہ کو مخاطب کر کے کہا کہ تم دونوں چلے جاؤ۔ میں ان لوگوں کو تمہارے حوالے نہیں کر سکتا اور نہ ان کے خلاف یہاں کوئی چال کامیاب ہو سکتی ہے۔ اس طرح حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی گفتگو کے نتیجے میں قریش کی سفارت ناکام ہو گئی۔

ہجرت حبشہ میں اب ایک ایسے مرحلے میں داخل ہوا چاہتی ہے جس میں براہ راست عقیدے کے حوالے سے ایک مکالمہ ہوتا ہے۔ جب اس دن قریش کی سفارت کو ناکامی ہوئی تو انہوں نے دوسرے انداز سے وار کرنے کا منصوبہ بنایا۔ دوسرے دن عمرو بن العاص نجاشی کے دربار میں پہنچے اور مسلمانوں پر الزام تراشی کی کہ مسلمان حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کوئی اچھا عقیدہ نہیں رکھتے۔ چنانچہ نجاشی نے پھر مسلمانوں کو طلب کیا تاکہ ان سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں استفسار کر سکے۔ مسلمانوں کو اندازہ تھا اور وہ گھبرا گئے، لیکن آپس میں یہی طے کیا کہ ہر سوال کا جواب سچ دیں گے چاہے حاکم وقت کو ناگوار ہی کیوں نہ گزرے۔ جب مسلمان اس کے دربار میں حاضر ہوئے تو نجاشی نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں سوال کیا۔ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا:

”ہم عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں وہی بات کہتے ہیں جو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے ہیں، یعنی عیسیٰ اللہ کے بندے، اس کے رسول، اس کی روح اور اس کا وہ کلمہ ہیں جسے اللہ نے پاکدامن حضرت مریم کی طرف القا کیا تھا۔“

اس پر نجاشی نے زمین سے ایک تیکا اٹھایا اور بولا کہ خدا کی قسم! جو کچھ تم نے کہا ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس سے اس تنکے کے برابر بھی بڑھ کر نہ تھے۔ اس کے بعد نجاشی نے مسلمانوں سے کہا کہ جاؤ تم لوگ میرے قلمرو میں امن و امان سے ہو۔ جو تمہیں گالی دے گا اس پر تاوان لگایا جائے گا۔ مجھے گوارا نہیں کہ تم میں سے میں کسی آدمی کو ستاؤں اور اس کے بدلے میں مجھے سونے کا پہاڑ مل جائے۔ اس طرح ایک پر مغز تقریر اور مدلل جواب اور مکالمہ کے نتیجے میں مسلمان نہ صرف ایک بڑی مصیبت سے نجات پا گئے بلکہ اپنی دعوت بھی اچھے انداز میں پیش کی۔ ڈاکٹر حمید اللہ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: ”ہمیں مزید تفصیلیں نہیں ملتیں کہ آیا نجاشی نے اسلام قبول کر لیا تھا کہ نہیں لیکن کچھ اشارے ایسے ہیں جن سے گمان ہوتا ہے کہ اگر اس وقت نہیں تو بعد میں نجاشی ضرور مسلمان ہو گیا تھا کیونکہ بخاری کی ایک روایت کے مطابق، جس دن نجاشی کی وفات کی مدینے میں خبر آئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی دن اس کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھی۔ ظاہر ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی غیر مسلم کے لیے نماز جنازہ نہیں پڑھ سکتے تھے۔ اس لیے گمان کرنا چاہیے کہ نجاشی نے اسلام قبول کر لیا تھا، اور اس کی اطلاع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھجوائی تھی۔“ (۱۲)

ہجرت حبشہ تاریخ اسلام کا ایک ایسا واقعہ ہے جس میں مسلمانوں کو ایک اور مذہب، نصرانیت، کے پیروکاروں سے ملنے، ان سے تعامل کرنے اور ان میں تبلیغ کرنے کا موقع میسر آیا۔ اس موقع پر انہوں نے نہ صرف اپنے دین کا دفاع کیا بلکہ بڑے موثر انداز میں اسلام کی تعلیمات کو بادشاہ وقت کے سامنے پیش کیا۔ قریش کی طرف سے ان مسلمانوں کے خلاف بظاہر گھبرائنگ کیا جا رہا تھا لیکن مشیت ایزدی اور حکمت سے مسلمانوں نے اس کو اپنے لیے ایک موقع (Opportunity) بنایا۔

جب اللہ کا حکم آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ ہجرت کی۔ مدینہ منورہ تشریف آوری کے بعد آپ نے فوری طور پر تین کام کیے: ایک مسجد نبوی کی تعمیر تاکہ مسلمانوں کا ایک مرکز قائم ہو سکے، دوسرے مواخاۃ کہ اس کے نتیجے میں مہاجرین کی بحالی اور انصار کے ساتھ اخوت کا رشتہ قائم ہو سکے، اور تیسرا کام آپ نے معاہدات کیے۔ اور بقول ڈاکٹر محمود احمد غازی تیسرا کام حضور نے یہ کیا کہ ایک چارٹر مرتب فرمایا جس کو بعض مورخین نے میثاق مدینہ کا نام دیا ہے۔ (۱۳)۔ یہ مہاجرین اور انصار اور انصار کے مختلف قبائل کے درمیان طے پانے والا معاہدہ تھا جو ۶۲۶ یا ۵۲۶ دفعات پر مشتمل ہے اور جس کی تفصیلات ہمیں سیرت اور حدیث کی کتابوں میں مل جاتی ہیں۔ اس معاہدہ کے دو حصے تھے۔ بعض لوگوں کے خیال میں یہ ایک معاہدہ تھا لیکن ڈاکٹر حمید اللہ کا خیال ہے کہ یہ دو الگ الگ دستاویزات تھیں اور وہ اسے انسانی تاریخ کا پہلا تحریری دستور بھی قرار دیتے ہیں۔ ابتدا میں یہ معاہدہ قریش کے مسلمانوں یعنی مہاجرین اور انصار کے مسلمانوں کے درمیان ہوا تھا۔ بعد میں غیر مسلم مدنی قبائل بھی اس میں شامل کیے گئے، جن میں مدینہ کے یہودی بھی تھے۔ یہ بطور شہریان ریاست کے شامل ہوئے تھے۔ (۱۴)

مدینہ منورہ میں کئی یہودی قبائل تھے اس بناء پر ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تعامل ہونا یقینی تھا۔ غزوہ بدر تک بیشتر یہودی قبائل اس معاہدہ میں شامل تھے البتہ بقیہ غزوہ بدر کے بعد اس میں شامل ہوئے۔ اس معاہدہ اور تعامل میں ہمیں مکالمہ کی براہ راست صورت نظر نہیں آتی البتہ جو بات اس معاہدہ میں یہود کے حوالے سے ملتی ہے کہ انہیں بھی ریاست مدینہ، جس کے کلی سربراہی نبی مہربان ﷺ فرما رہے تھے، کا مساوی شہری تسلیم کیا گیا تھا۔ اس معاہدہ کی ایک دفعہ یہاں نقل کی جا رہی ہے جس سے یہ نکتہ واضح ہو گا۔ انہ من تبعنا من یہود فان له النصر والاسوة غیر مظلومین ولا متناصرین علیہم یعنی جو یہود ہمارے اس معاہدہ میں ہماری پیروی کریں گے ان کو بھی اسی طرح سے مدد فراہم کی جائے گی اور ان کو وہی مساوات فراہم کی جائے گی جو قریش اور انصار کو دی جا رہی ہے۔ نہ ان پر ظلم کیا جائے گا اور ان کے خلاف کسی کی مدد کی جائے گی۔

اس کے بعد ایک ایک کر کے یہودی قبائل اس معاہدہ میں شامل ہوتے چلے گئے۔ سیرت کی کتابوں میں سات قبائل کا ذکر ہے۔ ان معاہدات کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں نبی کریم ﷺ کی ذات مبارکہ کو حتمی فیصلہ ساز ہستی (Final Authority) تسلیم کیا گیا۔ یہ بیثاق سنہ دو ہجری میں جاری ہوا جو ایک کثیر القبائل اور کثیر المذہبی معاہدہ تھا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر غازی کہتے ہیں: ”غیر مسلموں کی آبادیاں مدینہ کے باہر بھی تھیں۔ جو قبائل اسلام میں داخل نہیں ہوئے ان کو حضور اکرم ﷺ نے بعض مراعات عطا فرمائیں۔ بعض قبیلوں کو حضور نے لکھ کر دیا کہ من کان عل یہودیتہ او علی نصرانیتہ فانه لا یتلتی عنہا یعنی جو شخص اپنی یہودیت یا نصرانیت پر قائم ہے اس کو کسی آزمائش میں مبتلا نہیں کیا جائے گا اور اس پر کوئی زیادتی نہیں کی جائے گی۔“ (۱۵)

عام الوفود یعنی وہ سال جس میں عرب کے گوشے گوشے سے قبائل کے وفود آئے، کچھ نے اسلام قبول کیا اور کچھ نے سیاسی عہد باندھا اور آپ ﷺ کی قیادت و سیادت کو قبول کر لیا۔ سیرت کا یہ باب بہت اہم ہے کہ اس میں نہ صرف وفود آئے بلکہ انہوں نے حضور سے بات چیت کی، اسلام کے متعلق آگاہی حاصل کی اور اپنے تاثرات بیان کیے۔ مکالمہ بین المذاہب میں مکتائب نبوی ﷺ کا مطالعہ بھی دلچسپی کا موضوع ہے لیکن یہاں ہم آپ کے ایک مکتوب کا ذکر کریں گے جو ایک مکالمہ اور بعد ازاں ایک مباہلہ کی صورت اختیار کر گیا۔ محسن انسانیت ﷺ نے سلاطین مملکت کے علاوہ خاص خاص لوگوں کو مکتائب روانہ کیے اور ان مکتائب کو دعوت کا ذریعہ بنایا۔ انہی میں سے نجران کے عیسائیوں کے نام آپ کا مکتوب تھا۔ نجران مکہ سے یمن کی جانب سات مرحلے پر ایک بڑا علاقہ تھا جو تقریباً ۳۰ بستیوں پر مشتمل تھا اور یہاں سب کے سب عیسائی مذہب کے پیرو تھے۔ (۱۶) اپنے نامہ مبارک میں آپ نے اپنا پیغام ان کو ان الفاظ میں پہنچایا: ”ابراہیم، اسحق اور یعقوب کے الہ (معبود) کے نام سے آغاز کرتا ہوں۔ پھر اس کے بعد میں تم کو بندوں کی عبادت سے خدا کی عبادت کی طرف بلاتا ہوں۔ اور تمہیں بندوں کی آقائی سے خدا کی آقائی کی طرف پکارتا ہوں۔ اگر تم اس سے انکار کرو تو تم پر جزیہ لازم ہے۔ اور اگر اس سے بھی انکار کرو تو اعلان جنگ ہے۔“ یہ خط موصول ہونے کے بعد نجران کے مذہبی پیشواؤں نے باہم مشورہ کیا اور طے کیا کہ اکابر کا ایک وفد مدینہ جائے اور محمد ﷺ سے ملے۔ نجران کا یہ پہلا وفد تھا جو سیاسی اطاعت اور ٹیکس ادا کرنے کے وعدے پر ایک فرمان امن و حقوق حاصل کر کے واپس ہوا۔ (۱۷) کچھ

مدت بعد ۹ھ میں نجران کا ایک اور وفد مدینہ آیا۔ یہ ساٹھ افراد پر مشتمل تھا۔ ۲۴ آدمی اشراف سے تھے۔ جن میں سے تین آدمیوں کو اہل نجران کی سربراہی و سرکردگی حاصل تھی۔ ایک عاقب جس کے ذمہ امارت اور حکومت کا کام تھا، اس کا نام عبدالمسیح تھا۔ دوسرا سید جوثقانی اور سیاسی امور کا نگران تھا اس کا نام ایہم یا شمر حبیل تھا، تیسرا اسقف (پادری) جو دینی سربراہ اور روحانی پیشوا تھا، اس کا نام ابو حارثہ بن علقمہ تھا (۱۸)۔ ابو الحارث یا حارثہ شاہ قسطنطنیہ کی نگاہ میں بہت محترم تھا اور عیسائیوں میں اس کی کرامات کے بڑے چرچے تھے۔ (۱۹)

یہ لوگ چند روز مدینہ میں مقیم رہے۔ ان کو مسجد نبوی ﷺ میں اپنے مذہب کے مطابق ادائے نماز سے بعض صحابہ نے روکا لیکن حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اجازت دی۔ اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وسعت قلبی اور دیگر مذاہب کے بارے میں رواداری کے بڑے اسباق ہیں۔ وفد نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی اور اسلام کے بارے میں آپ سے سوالات کیے۔ آپ نے بھی ان سے سوالات کیے۔ یہ مکالمہ کی ایک بہترین شکل تھی، جس میں آپ نے انہیں اسلام کی دعوت دی اور قرآن کریم کی آیتیں پڑھ کر سنائیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مکالمہ جہاں دوسروں سے گفت و شنید اور باہمی رواداری کا نام ہے وہیں یہ اسلام کی دعوت و تبلیغ کا بھی ایک بہترین ذریعہ ثابت ہو سکتا ہے۔ لیکن انہوں نے اسلام قبول نہ کیا۔ مسیح علیہ السلام کے بارے میں آپ سے دریافت کیا کہ آپ اس بارے میں کیا فرماتے ہیں۔ اس موقع پر سورہ آل عمران کی وہ آیات نازل ہوئیں جس میں عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہے۔ جس رات یہ آیات نازل ہوئیں اس سے اگلی صبح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ہی آیات کریمہ کی روشنی میں انہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق اللہ کے فرمان سے آگاہ کیا۔ آپ نے انہیں ایک دن غور و فکر کے لیے دیا۔ لیکن انہوں نے آپ کی دعوت کو قبول نہیں کیا۔ جس کے بعد آپ ﷺ نے انہیں مباہلہ کی دعوت دی اور اپنے نواسوں حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما سمیت ایک چادر میں لپٹے ہوئے تشریف لائے۔ پیچھے پیچھے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا تشریف لارہی تھیں۔ جب وفد نے آپ کو دیکھا تو گھبرا گئے اور آپس میں مشاورت کر کے مباہلہ سے گریز کیا۔ انہوں نے بالآخر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے بارے میں حکم بنایا۔ اگلے روز ان کو ایک فرمان لکھ کر دے دیا گیا۔ جس میں ان کو فراخ دلی سے مذہبی آزادی اور سماجی خود مختاری دی گئی۔ (۲۱) اس فرمان میں اہل نجران کو زیادہ سے زیادہ حد تک مذہبی آزادی دی گئی (۲۱)۔ اس فرمان کے ذریعے ان کو تمام حقوق اور مراعات دی گئیں۔ ان سے کہا گیا کہ ان کے پادریوں کو ان کے عہدوں سے نہیں ہٹایا جائے گا اور ان کی عبادت گاہوں اور گرجوں کو نہیں چھیڑا جائے گا۔ لیکن وہ اسلامی شریعت کی بالادستی قبول کریں گے، مسلمانوں کو ٹیکس دیں گے اور سود کا کاروبار نہیں کریں گے۔ (۲۲) یہاں یہ بات دلچسپی کا باعث ہے کہ جب یہ وفد مدینہ پہنچا تو ان کی آمد کے بعد مقامی یہودیوں نے بڑی سرگرمی دکھائی اور عقائد کے حوالے سے کئی بحثیں چھیڑیں۔ اس کے بعد یہ وفد واپس چلا گیا۔ ان کے اندر اسلام پھیلنا شروع ہوا۔ سیرت نگاروں کا بیان ہے کہ سید اور عاقب نجران پلٹنے کے بعد مسلمان ہو گئے۔ (۲۳)

سیرت کے ان واقعات سے جو نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ آج کے دور میں مکالمہ بین المذاہب کو مسلمان مثبت انداز میں استعمال کر سکتے ہیں اور کر رہے ہیں۔ اس کی مختلف جہات کو مسلمان کس انداز میں دیکھتے ہیں، اس حوالے سے کونین میری کالج، یونیورسٹی آف

لندن، برطانیہ کے Roger Boase کے مطابق مسلمانوں میں کچھ وہ ہیں جو مکالمہ کو اپنے لیے ایک خطرہ تصور کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے اندر ایک شدت پسندی جنم لیتی ہے، اس کے برعکس کچھ لوگ اسے ایک ایسی نعمت گردانتے ہیں جس کے ذریعے نہ صرف دیگر مذاہب کے پیروکاروں کو سمجھا جاسکتا ہے بلکہ ان سے باہمی دلچسپی کے امور پر تبادلہ خیال بھی کیا جاسکتا ہے۔ (۲۴) امریکہ میں مکالمہ اور کشمیریت کے حوالے سے Jane Smith کے مطابق مسلمانوں کے تین نظریات ہیں، اول موجودہ سیاسی عوامل، دوسرے اسلام کے حوالے سے اخلاقی معاملات اور تیسرے اسلام اور دیگر مذہبی روایات کا تعلق۔ (۲۵) مسلمان اہل علم جن میں ڈاکٹر خالد ابو الفضل، ڈاکٹر عبدالعزیز سچندینا، ڈاکٹر امید صافی اور سب سے زیادہ متحرک شخصیت ڈاکٹر اسمعیل رجبی الفاروقی شامل ہیں۔ (۲۶) یہ وہ شخصیات ہیں جنہوں نے موجودہ دور میں مکالمہ بین المذاہب میں بھرپور حصہ لیا۔ فاروقی کے نزدیک مکالمہ کی سب سے اہم غرض وغایت 'دعوۃ' یعنی اسلام کی جانب لوگوں کو بلانا ہے۔ (۲۷) سیاسی اور حکومتی سطح پر بھی مسلمانوں کی جانب سے مکالمہ کی نئی جہات کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ اس حوالے سے اردن کے شہزادہ حسن بن طلال کی کوششیں کافی نمایاں ہیں جو مکالمہ کو موجودہ دور کی ایک اہم ضرورت سمجھتے ہیں۔ ان کی تقاریر و خطبات ان کی اس سوچ کو بہت نمایاں کرتی ہیں۔ سیاسی اور حکومتی سطح پر سابقہ خادم الحرمین الشریفین عبداللہ بن عبدالعزیز (مرحوم) کا نام سب سے نمایاں ہے۔ (۲۸) اس حوالے سے انہوں نے مکالمہ کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے سب سے پہلے جون ۲۰۰۸ء کو مکہ میں ایک کانفرنس کا انعقاد کیا جس میں دنیا بھر سے مسلم اسکالرز اور تنظیموں کو جمع کیا۔ اس کانفرنس کے مقاصد مکالمہ بین المذاہب کے حوالے سے مسلمانوں کی آواز کو نمایاں اور یکجا کرنا تھا۔ مکالمہ کے حوالے سے مسلم اہل علم اور خاص طور پر سعودی علماء کی رائے کی روشنی میں شاہ عبداللہ نے میڈرڈ اسپین میں جولائی ۲۰۰۸ء کو ایک عالمی سربراہی کانفرنس کا انعقاد کیا جس میں دنیا بھر سے سربراہان مملکت کے علاوہ ۳۰۰ کے قریب مندوبین شریک ہوئے۔ اس کانفرنس کے ذریعے دنیا کو یہ پیغام دیا گیا کہ مکالمہ وہ واحد ذریعہ ہے جس کے ذریعے مسائل کو حل کیا جاسکتا ہے اور دنیا کو امن کا گہوارا بنایا جاسکتا ہے۔ اسی سال نومبر میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں شاہ عبداللہ دنیا کے سربراہان کے ساتھ 'Peace of Culture' کے بنیتر تلے جمع تھے۔ (۲۹)

خلاصہ بحث

مکالمہ بین المذاہب ایک جدید اصطلاح ہونے کے باوجود قرآن مجید اور سیرت طیبہ میں اس کے حوالے ملتے ہیں۔ انبیاء سابقہ نے اپنی قوموں کے سامنے دعوت انتہائی مدلل اور ٹھوس انداز میں رکھی۔ فرعون کے دربار میں موسیٰ علیہ السلام کے کئی مکالمہ قرآن نقل کرتا ہے جس میں موسیٰ علیہ السلام فرعون اور اس کے درباریوں سے مکالمہ کرتے نظر آتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین ہجرت سے پہلے اور بعد، مشرکین، یہود اور نصاریٰ سے مکالمہ کرتے نظر آتے ہیں۔ خاص طور پر ہجرت حبشہ کے موقع پر حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کا نجاشی کے دربار میں اور عامر الوفود میں نجران کے وفد سے آپ کا مکالمہ آج کے دور میں ہمارے لیے رہنمائی کا ذریعہ ہیں۔ یہ بات پیش نظر رہے کہ مکالمہ کا مقصد محض مکالمہ نہ ہو بلکہ یہ دعوت کے ابلاغ اور اسلام کی تعلیمات کو دیگر ادیان کے پیروکاروں کے سامنے

پوری دیانت کے ساتھ پیش کرنے کا وسیلہ ہو۔ معذرت خواہانہ رویہ اختیار نہ کیا جائے بلکہ حقوق مصطفیٰ کے تقاضوں کے مطابق اسے ڈھالا جائے۔

References

1. Al-Imran :19
2. Maududi, Syed Abul A'la, Islam aur us ke Bunyadi Tassawurat, Islamic Publications, Lahore, Pakistan, 1992, p.112
3. Siddiqui, A. (1997). Christian Muslim Dialogue in the Twentieth Century London Macmillan, p.23
4. Al-Baqarah:256
5. Al-Nahl:125
6. Seerat Ibn Hisham with reference to Ar-Raheeq Al-Makhtum, p.90
7. Mubarakpuri, Safiur Rahman, Ar-Raheeq Al-Makhtum, Maktaba al Salfia, Lahore, p.96
8. Dr.Hamidullah, Muhammad, Khutbat-e-Bahawalpur, Islamic Research Institute, Islamabad, 1995,p.355
9. Naeem Siddiqui, Mohsin-e-Insaniyat, Islamic Publications, Lahore, Pakistan, 1988, p.179
10. Dr.Hamidullah, Muhammad, Khutbat-e-Bahawalpur,p.361
11. Ibid
12. Ibid, p362
13. Ghazi, Mahmood Ahmad, Dr, Mahazirat-e-Seerat, Al Faisal Publishers, Lahore,2009,p.337
14. Mahazirat-e-Seerat,p.341
15. Ibid
16. Mubarakpuri, Safiur Rahman, Ar-Raheeq Al-Makhtum, p.604
17. Naeem Siddiqui, Mohsin-e-Insaniyat,p.507
18. Mubarakpuri, Safiur Rahman, Ar-Raheeq Al-Makhtum, p.604
19. Naeem Siddiqui, Mohsin-e-Insaniyat,p.540
20. Ibid
21. Mubarakpuri, Safiur Rahman, Ar-Raheeq Al-Makhtum, p.604
22. Mahazirat-e-Seerat,p.359
23. Fath al Bari 8/49, Zad al-Ma'ad 3/14 to 83with reference to Ar-Raheeq Al-Makhtum, p.606
24. Boase, R. (2005). Ecumenical Islam: A Mulsim Response to Religious Pluralism Islam and Global Dialogue. R. Boase. UK, Ashgate. ,p.247
25. Smith, J. I. (2007). Muslims, Christians and the Challenges of Interfaith Dialogue. Newyork, Oxford.,p.123
26. Nyang, S. (1997). "Seeking the Religious Roots of Pluralism in the United States of America: An American Muslim Perspective." Journal of Ecumenical Studies (34),p.402-417
27. Faruqi, I. R. (1998). Islam and Other Faiths. Leicester, The Islamic Foundation,p.241
28. http://en.wikipedia.org/wiki/Abdullah_of_Saudi_Arabia
29. Source: Arab News

Bibliography

1. Amir Hussain, in (2003). Muslims, pluralism, and interfaith dialogue. Progressive Muslims: On Justice, Gender and Pluralism. O. Safi. Oxford, Oneworld Publications England
2. Ayoub, M. (July 2004). "Christian-Muslim Dialogue: Goals and Obstacles." The Muslim World , p. 94/3.
3. Boase, R. (2005). Ecumenical Islam: A Mulsim Response to Religious Pluralism Islam and Global Dialogue. R. Boase. UK, Ashgate.
4. Boase, R. (2005). Islam and Global Dialogue: Religious Pluralism and the Pursuit of Peace.

-
- Burlington, Ashgate Publications, USA.
5. Denffer, A. V. (1991). *Dialogue Between Christians and Muslims* London Islamic Foundation, London
 6. Faruqi, I. A. (1998). *Islam and Other Faiths*. Leicester, The Islamic Foundation, UK.
 7. Khan, M. A. M. (2004). *Living on Borderlines: Beyond the Clash and Dialogue*. Muslims' Place in the American Public Square. Z. H. Bukhari. California, Walnut Creek, Calif.: Altamira.
 8. Nyang, S. (1997). "Seeking the Religious Roots of Pluralism in the United States of America: An American Muslim Perspective." *Journal of Ecumenical Studies* (34).
 9. Sachedina, A. A. (2001). *The Islamic Roots of Democratic Pluralism*. New York, Oxford University Press.
 10. Safi, O. (2003). *Progressive Muslims: On Justice, Gender and Pluralism*. Oxford UK, Oneworld Publications England
 11. Smith, J. I. (2007). *Muslims, Christians and the Challenges of Interfaith Dialogue*. Newyork, Oxford.